© rasailojaraid.com

الہامی مدرسہ اور اس کا الہامی مکتبِ فکر

(پہلی قسط)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

الحمدللہ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

آج جب کہ دار العلوم کی تاریخ اور اس کے کارناموں کی تفصیل آپ کے سامنے آ رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی معنویت اور حقیقت پر بھی ایک مختصر روشنی ڈال دی جائے کہ اس کے بغیر اس کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی، گوفن تاریخ کے لحاظ سے اس قسم کے کشفی اور الہامی واقعات کو اہمیت نہ دی جائے اور انھیں محض خوش اعتقادی کا ثمرہ کہہ کر نظر انداز کردیا جائے لیکن جب کہ اُس کی بنیادوں ہی میں یہ معنوی حقیقت اساسی حیثیت رکھتی ہو، بلکہ اس کی مجموعی تاریخ کی روح ہی یہ حقائق ہوں جس سے اس کی امتیازی شان کا نشوونما ہوا ہو، تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی حقیقی تاریخ ہی ان خصوصیات میں مضمر ہے اور ان کا ذکر نہ کیا جانا اس کی امتیازی شان کو پسِ پردہ ڈال دینا ہے، اس لیے ضروری تھا کہ اس کی ظاہری تاریخ کے ساتھ اس کی باطنی تاریخ بھی سامنے آجائے کہ یہ ادارہ اول سے لے کر آخر تک کس معنوی اساس پر قائم ہے اور کن حقائق سے اس کی روز افزوں مقبولیت کا نشوونما ہوا ہے۔

اس سلسلے میں بنیادی طور پر اولین چیز اس کا مکتبِ فکر ہے جس کے واضح کیے بغیر اس کی معنویت پر روشنی نہیں پڑسکتی اور نہ ہی اس کا دینی رُخ واضح ہوسکتا ہے۔ یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، اول یہ کہ اس کا مرکزی فکر کیا ہے جس سے اس کے قیام کا نصب العین متعین ہو، اس مرکزی فکر کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ جس سے اس کے گوشہ ہائے عمل متعین ہوں، اس فکر کا سرچشمہ کیا ہے جہاں سے یہ فکر اسے ملا، اس کے پہنچنے کا راستہ کیا ہے جس سے اس کا استناد اور قابل اطمینان ہونا نمایاں ہو۔ یہی وہ سوالات ہیں جنھیں حل کیے بغیر اس کی معنویت اور حقیقت پر روشنی نہیں پڑسکتی۔

سو اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ دار العلوم کا سلسلۂ استناد محدثِ ہند حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے چلتا ہے، جس کی سند متصل اوپر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا علم اور ذوق وفکر شاہ عبدالعزیز، پھر شاہ محمد اسحاق اور شاہ عبدالغنی کے واسطوں سے حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ اسرارہم تک پہنچا اور انھوں نے اس ادارۂ مقدسہ یعنی دار العلوم دیوبند کے ذریعے سے اسے عالمگیر بنایا، سو بلاشبہ کتاب وسنت کی تعلیم اور توحید ورسالت کی عظمت وتوقیر کی وضاحت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وبیان میں حضرت شاہ ولی اللہ کا ایک مخصوص رنگ اور ممتاز اندازِ تفہیم ہے، جس کا اولین جوہری مادہ وحی خداوندی اور اس کا تفقہ ہے، جو ان کا اساسِ فکر ہے، پھر تعلیم وتلقین کے دائرے میں اس کی وہ نوعیتِ بیان ہے جو ہر دور کی نفسیات کو اپیل کرتی ہے جس کے مختلف اجزاء ترکیبی ہیں، جو حسبِ نفسیاتِ زمانہ اس میں کارفرما ہوتے آرہے ہیں، پھر یہ اندازِ فکر محض کسی عقلی سوچ بچار یا ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ الہامی ہے، جس کی الہامی نوعیت کو خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ہی اپنی معرکۃ الآراء تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں ظاہر کر دیا ہے۔ فرمایا کہ:

> ''ایک دن نماز عصر کے بعد متوجہ الی اللہ بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک ظاہر ہوئی اور سر سے مجھے ڈھانپ لیا، مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی کپڑا مجھ پر ڈال دیا گیا ہے اور اس حالت میں میرے دل میں یہ ڈالا گیا کہ یہ دین کی ایک خاص نوعیت کے بیان کی طرف اشارہ ہے اور اس وقت میں نے اپنے سینہ میں ایک نور محسوس کیا جو ہر لحہ بڑھتا اور پھیلتا جاتا تھا، کچھ عرصہ کے بعد میرے رب نے مجھے الہام فرمایا کہ قلم اعلیٰ (قلم تقدیر) نے جو امور میرے لیے لکھے ہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ میں کسی دن اس امر کے لیے کھڑا ہو جاؤں جسے پھیلتے ہوئے نور کی شکل میں، میں نے دیکھا تھا، یعنی دین کا ایک خاص بیان وتشریح، بالیقین زمین چمک اٹھی اپنے رب کے نور سے اور اس کی شعاعیں منعکس ہوئیں غروب کے وقت، روشنی نے اپنا عکس زمین پر ڈالا ہے (یعنی دل کی ہر سمت پر یہ نور چھا گیا جو علم حقائق کا ایک خاص نور تھا) اور (وہ یہ کہ) شریعت مصطفویہ اس دور میں حجت وبرہان کے مکمل لباس میں نمایاں ہونی ہے (جو اس عقل پسندی کے دور کی نفسیات کا تقاضا ہے) پھر میں نے مکہ مکرمہ میں ایک روز دین کے دو اماموں حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو خواب میں دیکھا کہ گویا ان دونوں نے مجھے ایک قلم عطا کیا اور فرمایا کہ یہ ہمارے جدامجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم ہے۔ تب میں بار بار اپنے دل میں سوچتا رہا کہ اس فن (اسرار وحقائق) میں ایک رسالہ مدوّن کروں جو مبتدی کے لیے تو بصیرت بنے اور منتہی کے لیے تذکیر ثابت ہو (تو ''حجۃ اللہ البالغہ'' تصنیف کی)۔

اس سے واضح ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے بالہامِ خداوندی بھانپ لیا تھا کہ اب دین کو محض نقل وروایت سے عقیدتمندانہ سمجھنے کا زمانہ نہیں رہا، عقلی مطالبوں اور حجت طلبیوں کا دور شروع ہو گیا ہے، حقیقت شناسی، حق طلبی اور اعتقادی روایات پر ایمانی پختگی سست پڑ گئی ہے اور عقل پرستی غالب آتی جا رہی ہے، تا آنکہ لوگ مغیبات کو بھی عقل ہی کی ترازو میں تولنے کی فکر میں لگ گئے ہیں۔ اس لیے جب تک منقول دین کو معقول کا لباس پہنا کر پیش نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اس دور کی عقل پرست طبیعتیں مطمئن نہ ہوں گی اور اسے اِنْ ھٰذَا اِلَّا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ کہہ کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ناقابلِ التفات ٹھہرا دیں گی اور دین سے محروم ہو جائیں گی۔ اس لیے شاہ صاحب نے بالہامِ خداوندی اس جامع منقول و معقول مکتبِ فکر کے ذریعے دین پہنچانے کا فیصلہ فرمایا تا کہ پورا دین جیسے نقل و روایت کے لحاظ سے کامل ہے اسی طرح عقل و روایت کی رو سے بھی کامل ہی نمایاں ہو، اور کسی بھی عقل پرست یا درایت دوست انسان کے لیے ناقابلِ التفات نہ ہونے پائے اس لیے یہ نادرِ روزگار کتاب حجۃ اللہ البالغہ خاص اس موضوع پر تصنیف فرمائی جس سے صاف واضح ہے کہ بیان دین کا یہ فکر خالص الہامی تھا جو ولی اللّٰہی قلب میں القا ہوا، ساتھ ہی حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی واضح فرما دیا کہ یہ عقلی مصالح اور حکم و اسرار دین کی بنیاد نہیں ہیں کہ ان پر دین موقوف ہو بلکہ اصلی بنیاد صرف وحی الٰہی اور اس کی مستند روایت ہے، یہ عقلی براہین محض اس کے اثبات اور لوگوں کے قریب الفہم کرنے کے ذرائع ہیں، خود عقائد و مقاصد دین کا ماخذ نہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی فلسفی یا عقلی اصول کسی عقیدہ کے مخالف ہو تو اسے ترک کر دیا جانا اور عقیدہ کو مضبوطی سے تھام لیا جانا ہی حقیقی دین ہوگا، اس لیے اُس الہامی زبان میں اس بیان کی نوعیت اور درجۂ حجیت پر بھی روشنی ڈالی اور فرمایا کہ:

> اور جب ہر ذی رائے کا اصرار اپنی رائے پر ظاہر ہونے لگا اور لوگوں کے راستے مختلف ہو گئے تو ایک قوم نے ظاہر کتاب و سنت کو اختیار کر لیا اور عقائد سلف کے بارے میں اُسے دانتوں سے مضبوط پکڑ لیا، فلسفیانہ یا عقلی اصول کی موافقت یا مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں کی، پھر بھی انھوں نے ان عقلی اصول کو اختیار کیا تو مخالفین کے رد کے لیے یا زیادہ اطمینان حاصل کرنے کے لیے، نہ کہ اُن سے عقائد اخذ کرنے کے لیے۔ بس یہی ہیں وہ اہل السنّت۔

پھر عقائد و اصولِ دین ہی نہیں، عملی مسائل کے بارے میں مزید فرمایا کہ:

> اور (اس سنت نے ہم پر) یہ بھی واجب کیا ہے کہ احکامِ شرعیہ کے ماننے اور عمل کرنے میں جب کہ وہ صحیح روایت سے ہم تک پہنچ جائیں ان مصالح کے پہچاننے پر ہرگز توقف نہ کیا جائے، کیوں کہ عموماً عام قسمیں اس معرفت میں مستقل نہیں ہیں (جب تک علم وحی ان کی رہنمائی نہ کرے) نیز اس لیے بھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات ہماری (جزوی) عقلوں سے کہیں زیادہ باوثوق اور واجب الاعتماد ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اہل السنّت والجماعت کے مسلک پر عقل اصل نہیں بلکہ وحی اصل ہے، عقل وحی پر حاکم نہیں جیسا کہ معتزلہ سمجھے ہوئے ہیں بلکہ وحی عقل پر حاکم اور عقل کے صحت و سقم کا معیار ہے، پس عقیدہ ہو یا عمل اس کی بنیاد وحی پر قائم کی جائے گی نہ کہ اپنی عقلی سوچ بچار پر، کیوں کہ دینِ خداوندی نقلِ صحیح پر مبنی ہے جو روایت ہو کر ہم تک پہنچا ہے، عقلی اختراعات پر نہیں جو ہمارے ہی اندر سے اُبھرتے ہیں، آسمان سے نازل نہیں ہوتے۔ یہ عقلی مصالح محض ردِّ خصوم کے لیے یا خصوم اور مخالفین کو انہی کی زبان میں دین سمجھانے کے لیے یا بطور خود ذاتی اطمینان حاصل کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے ہیں نہ کہ ایمان لانے یا دین بتانے کے لیے ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ نقلی اور روایتی دین کو عقلی دلائل، طبعی مصالح اور روحانی اسرار وحکم کے جامہ میں پیش کیا جانا اور دین کو دین فطرت دکھلا کر اس دور کی عقل زدہ طبیعتوں کے لیے قابلِ قبول بنا دینا اس الہامی مکتبِ فکر کا پہلا جزو ہے جو حضرت شاہ صاحب کے قلب میں منجانب اللہ القا ہوا۔ لیکن حجۃ اللہ البالغہ ہی کے اسلوبِ بیان اور طرزِ تفہیم سے جس میں عقائد ومسائل کے اثبات کے لیے یہ عقلی حکمتیں اور حجتیں پیش فرمائیں ہیں یہ بھی نمایاں ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے ان حکمتوں کو متعلقہ آیات وروایات کی طرف منسوب فرما کر انہیں زیادہ تر کشفی اور ذوقی رنگ میں پیش فرمایا ہے، اس لیے قدرتی طور پر اس سے صرف وہی عقل پسند طبیعتیں مطمئن ہوسکتی ہیں جو کسی نہ کسی حد تک ان روایات کو مانتے ہوئے اس ذوق اور اندرونی وجدان کی کوئی اہمیت ذہن میں لیے ہوئے ہوں اور ان کا ایمانی احساس بالکل مردہ نہ ہو چکا ہو، ورنہ جو لوگ سرے سے اس اعتقاد اور ذوق کے اس کوچہ ہی سے نابلد اور بے ذوقِ محض ہوں وہ اسے علم وحکمت کہنے کے بجائے تخیل آفرینی کا عنوان دے کر اڑا دیتے اور بے التفاتی کی نذر کر کے دین سے بدستور محروم رہ جاتے چہ جائیکہ اس سے کوئی فائدہ اٹھاتے، چنانچہ اس عقل پسندی کے ابتدائی دور میں جو انگریزوں کی دراندازیوں، عیارانہ سازشوں اور ان کے ملحدانہ نظریات کا بھی ابتدائی ہی دور تھا، اس عقل ونقل کی آمیزش سے وہ لوگ راہ راست پر آتے رہے جنھیں کو عقل چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی لیکن پھر بھی وہ اس دور کے عمومی ماحول اور دینی رنگ کے پھیلے ہوئے اثرات سے کچھ نہ کچھ مانوس اور متاثر ہونے کی وجہ سے اتنے بیگانۂ دین نہیں ہوگئے تھے کہ کھلے بندوں الحاد دہریت کی دلدل میں پھنس جاتے یا اندرونی ذوق ووجدان اور ضمیر کی سلامتی سے کلیتہً بیگانہ ہو کر صریح انکار وتکذیب پر آجاتے۔

لیکن اس دور کی طفولیت کا زمانہ گذر جانے پر جب عقل پسندی کے شباب کا دور آیا اور انگریزی اقتدار بھی مخفی اور سازشی دور سے گذر کر کھلے میدانوں میں دوڑنے لگا تو اُسی نسبت سے یہ ذوق بھی گھٹنے لگا، بلکہ اس کی ساتھ جب کہ فرنگی نظریات اور الحادی افکار دین کے مقابلہ میں ایک حریف کی صورت میں سامنے آنے لگے اور فلسفے کے ساتھ سائنس کا جوڑ لگ جانے سے یہ نظریات محسوسات کی صورت اختیار کرنے لگے تو عقلِ محض بھی پیچھے رہ گئی اور اُس کے تخت حکومت پر یلغار کر کے محسوس پسندی نے قبضہ جما لیا اور کسی منقول کو معقول بنا کر پیش کر دیا جانا بھی اس کے مان لینے کا ضامن نہ رہا جب تک کہ اسے محسوسات کا لباس پہنا کر سامنے نہ کر دیا جائے، کیوں کہ زمانہ کی رفتار اور ہوا کا رُخ بتلا رہا تھا کہ اب عنقریب نیوٹن اور گوئٹے کی جگہ لینن اور اسٹالین لینے والے ہیں اور نظریاتی فلسفوں کے بجائے حِسّی اور معاشرتی ازم اور حسیاتی فلسفوں کی داغ بیل پڑنے والی ہے، جو کسی بھی نظریاتی اور عقلیاتی فلسفہ کو اس وقت تک اہمیت دینے کے لیے تیار نہ ہوں گے جب تک کہ اس میں عملیاتی اور محسوس عوامل کارفرما نظر نہ آئیں بلکہ ان معاشرتی اور حسیاتی ازموں کے گلے میں زور وتوانائی کی تلواریں بھی حائل نہ ہوں، چنانچہ انگلستان کی پارلیمنٹ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حسّی اور مادّی طاقتوں کے گھمنڈ میں گلیڈ اسٹون کی یہ صدا گونجنے والی تھی کہ ''ہم اب اس درجہ طاقتور ہو چکے ہیں کہ اگر آسمان بھی ہم پر گرنا چاہے تو ہم اُسے اپنی سنگینوں کی نوک پر روک لیں گے'' پھر کچھ وقفہ کے بعد اسٹالن کا یہ نعرہ فضا میں گونجنے والا تھا کہ اب ہم نے روسی سرحدوں میں خدا کا داخلہ ممنوع قرار دیدیا ہے، گگارین چاند کے سفر سے واپس ہو کر یہ کہنے والا تھا کہ میں زمین کے مرکز سے گذر کر آسمانی فضا میں چکر کاٹتا رہا اور میں نے ایک گھنٹہ میں سترہ مرتبہ سورج کا طلوع وغروب دیکھا، مگر خدا کو وہاں کسی جگہ نہیں پایا، نیز اس دنیائے دنی میں کھلے بندوں اینٹی خدا اور اینٹی رسول انجمنیں بھی قائم ہونے والی تھیں، صرف اس لیے کہ خدا انھیں آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ معاذ اللہ۔

حاصل یہ کہ عقلی تگ وتاز کے بجائے حسّی دوڑ شروع ہو رہی تھی اور دل ودماغ کی طاقتوں کی جگہ صرف پیشانی کی آنکھ کی حکمرانی جمنے والی تھی۔ بالفاظ دیگر وہ پرانی یہودیت دنیا کے سامنے پھر سے زندہ ہو کر سامنے آنے والی تھی جس نے یہود کے ایمان کو غارت کیا تھا اور وہ یہی تھی کہ اُنھوں نے اپنی دینی بنیاد پر تیشہ چلاتے ہوئے آنکھ ہی کو اپنا معبود ٹھہرالیا تھا، اور یہ کہا تھا کہ: ''ہم (اے موسیٰ) تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو کھلی آنکھوں نہ دیکھ لیں''۔

اور یہ کہ ہم خدائی کلام کو کلام الٰہی تسلیم نہیں کریں گے جب تک کہ خدائی آواز اپنے ان کانوں سے نہ سُن لیں۔ حتی نسمع کلام اللہ۔ گویا یہ زیغ اصول کی شکل اختیار کر چکا تھا کہ جو چیز آنکھ سے محسوس نہ ہو وہ موجود بھی نہیں ہے، جس کا حاصل یہی تو تھا کہ عقل کی جگہ حِس اور معقولات کی جگہ محسوسات لے چکے تھے، اس لیے وہ معنویات کو بھی جو دل سے دیکھنے کی چیزیں اور حسّی شکل وصورت سے بری وبالا ہیں آنکھوں ہی سے دیکھ لینے کے خواہش مند تھے جو فطرت کے خلاف تھا، پس انھیں دین جیسی لطیف اور معنوی حقیقت سمجھانے کے لیے محض عقلی قمیص میں سامنے لے آنا کافی نہیں رہ گیا تھا، جب تک اسے محسوسات کا لبادہ اُڑھا کر سامنے نہ لایا جائے اس لیے جیسے اس عقل پسندی کے دور کے آغاز پر حضرت الامام شاہ ولی اللہ نے بالہامِ الٰہی بیان دین کے لیے عقلی حجت وبرہان کی راہ ڈالی اسی طرح اس حِس پسندی کے دور کے آغاز پر اُنہیں کی چوتھی عملی پشت کے ایک جوہر فرد حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ نے دنیا کی یہ صورت حال دیکھ کر بیانِ دین میں محسوسات کے لباس کی نشان دہی بھی فرمائی، گو اس کے عملی دور کا آغاز بعد میں ہوا، چنانچہ یہ حقیقت خود اُنہی کے واقعہ سے نمایاں ہوتی ہے جسے حاجی امیر شاہ خاں صاحب خورجوی متوسّل خاص حضرت قاسم العلوم نانوتویؒ نے طلبہ کی ایک جماعت کے سامنے بیان فرمایا جس میں یہ احقر راقم الحروف بھی حاضر تھا، کہ حکیم نور الدین خلیفۂ اول مرزا قادیانی، حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کے تلامذہ میں شامل تھا، گو بعد میں گمراہ ہو گیا، اس کے فارغ التحصیل ہو جانے پر حضرت شاہ صاحب نے اُس سے فرمایا کہ میاں نور الدین کتابیں تو تم نے ختم کر لیں اب کچھ اللہ اللہ کرنا سیکھو، اُس نے کہا کہ حضرت قرآن پڑھ لیا، حدیث پڑھ لی اس کے سوا اور اللہ اللہ کیا ہے؟ فرمایا کہ میاں نور الدین تم نے میرے درسِ حدیث سے یہ اندازہ لگالیا ہوگا کہ میں منقول کو معقول کر کے دکھلا دیتا ہوں، اللہ اللہ کرنے سے یہ معقول محسوس بن جائے گا، منشا یہ تھا کہ کثرت ذکر سے ہی اشراق قلبی پیدا ہوتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس کے نور سے عالمِ معنویات کے ساتھ عالمِ حسیات کے حقائق ومعارف بھی کھل جاتے ہیں، اشارہ اس طرف تھا کہ اب دین کو صرف نظری طور پر عقلی رنگ میں پیش کر دیا جانا کافی نہ ہوگا، جب تک اُسے حسّی انداز کے دلائل اور محسوس شواہد سے دنیا کے آگے نہ رکھا جائے، جس کا راستہ ریاضت ومجاہدہ اور کثرتِ ذکر کے سوا دوسرا نہیں کہ اس سے قلب میں معرفت وبصیرت اور اس سے انکشافِ حقائق کی شان پیدا ہوتی ہے اور نظریاتی مسائل محسوسات بن کر نظر آنے لگتے ہیں۔

پس اس بیانِ دین میں حضرت الامام ولی اللہ نے تو عقلی مصالح واسرار کو شامل کیا تھا اور ان کے اس طبقۂ چہارم کے تلمیذ خاص (حضرت شاہ عبدالغنیؒ) نے اسی کے ساتھ حسّی اور مشاہداتی دلائل وشواہد کو بھی شامل کر دیا ہے جو اسی الہامِ ربانی اور القا، عرفانی کے نور کا اثر تھا، لیکن تھا بہر حال یہ بھی وہی ذوقی اور خطابی انداز جو آیات وروایات کی حکمت کے طور پر اپنوں یا ذہنی قرب کے افراد ہی کے لیے مؤثر اور اُنہی کے جذبات کو اپیل کر سکتا تھا، ایسی استدلالی شان کا نہ تھا کہ ایک منکرِ محض اور معاند خالص کو بھی جو کتاب وسنت اور وحی الٰہی کا انکار دل میں چھپائے ہوئے ہو اور خود سرے سے وجودِ صانع کا منکر، نبوت ہی ضرورت سے منحرف ہو کر حشر ونشر ہی کا سرے سے قائل نہ ہو اور ان عقائد کو محض ایک دل خوش کن داستانِ پارینہ سمجھے ہوئے ہو تو آیت وروایت یا اس کی نسبت سے پیدا شدہ حکمت وبصیرت اس پر کیا اثر انداز ہو سکتی تھی جو آیت وروایت کا نام سنتے ہی بدک جاتا ہو، اس لیے ضرورت تھی کہ آیات وروایات کا ابتدائی ذکر کیے بغیر دین کو اس کے سامنے محض سائنٹیفک اصول سے فلسفیانہ پیرایوں اور موجودہ دور کے حسیّاتی ازموں کے انداز سے اس طرح پیش کیا جائے کہ قطع نظر نقد وروایت کے اور قطع نظر ان کے عقلی دلائل اور محسوس براہین کے، اسلام اس کے سامنے مستقلاً ایک فلسفہ اور ازم کی صورت سے نمایاں ہو۔ ابتدا میں یہ محسوس ہی نہ ہو کہ یہ کوئی آسمانی دین پیش کیا جا رہا ہے بلکہ احساس یہ ہو کہ یہ ایک مستقل فطری اور طبعی فلسفہ اور دستورِ زندگی ہے جس کے اپنائے بغیر آدمی اپنی زندگی کبھی بھی خوش گواری کے ساتھ نہیں گذار سکتا اور جب اُس کی عقل کی تنگ نائیوں میں اس دین سے اُنس کچھ رواں دواں ہو جائے تو آخر میں کہا جائے کہ یہی تو وہ اسلام ہے جس سے تم بدکے ہوئے تھے۔

اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر اگر آج کے دور کو دیکھا جائے تو یہ صورتِ حال اُس میں اپنی انتہائی منزل تک پہنچ چکی ہے، آج کی جنگ عقائد وافکار کی نہیں بلکہ نظریات کی ہے اور حقیقتاً نظریات کی بھی نہیں بلکہ زیادہ تر عنوانات اور اسالیبِ بیان کی ہے، آج اگر ایک حقیقت کو خدا اور رسول کا نام لے کر پیش کیا جائے تو قومیں اس سے راہِ فرار اختیار کر لیتی ہیں اور وہی حقیقت اگر تمدن ومعاشرت اور دنیوی مفادات کے عنوان سے پیش کی جائے تو اسے قابل توجہ ہی نہیں بلکہ لائق قبول سمجھتی ہیں جس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ اصل دشمنی خدا اور رسول کے نام سے ہے، ان کے پیغام سے نہیں ہے بشرطیکہ وہ ان کے نام سے پیش نہ کیا جائے جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ آج کے سطحیت پسند دور میں ساری مذہبی جنگیں حقائق ووقائع کی نہیں صرف عنوانات کی ہیں، یعنی سطحیت پسندی اس حد پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آچکی ہے کہ معانی اور حقائق تو بجائے خود ہیں صرف تعبیر اور تعبیری نسبتوں پر حق وباطل کا مدار ٹھہر گیا ہے، مثلاً اگر ابتداءً ہی تلقینِ عقیدہ کسی دینی روایت یا مذہب کے نام سے سامنے آئے خواہ کتنی ہی حکمتیں کھول دی جائیں وہ بدستور وحشت وفرار کی نذر ہوتی رہے گی، اور اُسی کو اگر سائنس، فلسفہ، معاشیات اور تمدنی مصالح کے عنوان سے ایک ازم کی صورت میں پیش کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ وحشت وفرار کا ذریعہ ثابت نہیں ہوتی بلکہ لائق توجہ اور قابلِ قبول ہو جاتی ہے گویا دنیا لفظ پسند اور معنی بیزار ہو چکی ہے، اس لیے محسوسات اور لفظی عنوانات ہی سے اس کی اصلاح بھی ممکن ہے بشرطے کہ وہ لفظ انہی معانی کے ہوں جنھیں دلوں میں پیوست کرنا منظور ہو، اس لیے اس دور کے مریضانِ روح کے علاج کے لیے اس ولی اللّٰہی خاندان کی پانچویں عملی پشت میں ایک فرد اُٹھا جس نے اس مذکور نہج پر دین ومذہب، دینی عقائد اور دینی اصول وکلیات کو اسی الہامِ ربانی کی تحریک سے ابتداءً ہی قرآن وحدیث یا مذہب وملّت کا نام لیے بغیر حقائق قرآن وحدیث کو ایسے استدلالی اور منطقی طرزِ بیان سے زمانہ کے سامنے پیش کیا جیسے وہ اس زمانہ کے حسبِ حال ایک مضبوط اور مستحکم ازم پیش کر رہا ہے جس کا ظاہری عنوان ابتداءً نہ اعلانِ مذہب ہے نہ اطلاعِ غیب مگر انتہاءً وہی مذہب اور عقیدۂ غیب ہے، مگر اس ڈھنگ سے کہ جیسے وہ خالص ایک فلسفیانہ ازم کی تلقین ہے کہ اُس کے مانے بغیر نہ اس دور کی معاشرت صحیح اسلوب سے چل سکتی ہے نہ سیاست ومدنیت اور نہ ہی مابعد الموت کی زندگی استوار اور کامیاب ہو سکتی ہے، اس لیے اس نے ایک نئے حیاتی فلسفہ وحکمت کی بنیاد ڈالی، ہم اُسی شخصیت کو حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، جو شاہ ولی اللہ شاہ عبدالعزیز، شاہ محمد اسحٰق اور شاہ عبدالغنی کے علوم کا نچوڑ اور ان کے دینی تفقہ کا خلاصہ تھا اور اس نے وہی امانت جو ولی اللّٰہی دور سے لی تھی اس دور کے مناسب حال حکیمانہ انداز سے دنیا کے سامنے رکھ دی، چنانچہ اس دور کے ذہن کے پیش نظر حضرت قاسم العلوم کی تحریرات اور تصنیفات میں سطح پر آیات وروایات یا دینی اصطلاحات کا ابتداءً کہیں ذکر نہیں آتا گو وہ معنیً آیات وروایات ہی ہوتی ہیں بلکہ نمایاں طریق پر تعبیری حصہ بلحاظ صورت استدلال شکلوں، برہانی حجتوں اور حِسّی شواہد ونظائر کی صورتوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اندرونی حصہ بلحاظ معانی ومرادات ایمانی حقیقتوں، عرفانی دقیقوں اور کشفی وانشراحی کیفیتوں پر مشتمل ہوتا ہے، اس لیے حضرت قاسم العلوم نے اس دور کے مسلمات اور محسوسات کے آئینہ میں آیات وروایات کا جلوہ نمایاں کیا ہے، مگر فلسفیانہ استدلال اور منطقیانہ طرز اثبات سے اس طرح جیسے ایک مستقل فلسفۂ حیات پیش کیا جا رہا ہے۔ مگر آخر میں کھلتا یہ ہے کہ یہی تو وہ اسلام ہے جس کے نام سے دنیا کو وحشت زدہ کر دیا گیا تھا، اس طرح اُن پر یہ کھل جاتا ہے کہ وہ صرف ناموں اور عنوانوں پر لڑ رہے تھے۔ حقیقتِ حال کی انھیں ہوا بھی نہیں لگتی تھی، درحالیکہ فطرۃً وہ حقیقت سے دور نہ تھے لیکن جب اس حکیمانہ طرز سے اُن پر حقیقت کھل گئی تو انجام کار وہی عنوان اس پر آگیا جو اس حقیقت کے لیے اللہ رب العزت نے وضع فرمایا تھا یعنی اسلام جسے شاہ ولی اللہ اور اُن کے پیشروؤں نے پیش کیا تھا۔ (جاری ہے)

© rasailojaraid.com